

نقطہ نظر*

قومی ثقافت کی تشکیل**

ڈاکٹر جمیل جالبی

یہ عنوان بظاہر تو تین بنیادی لفظوں پر مشتمل ہے لیکن اس کے اندر معنی کی ایک دنیا چھپی ہوئی ہے۔ معنی کی وہ دنیا جس کے رشتے حیات و کائنات تک پھیلے ہوئے ہیں اور جس کے تحت وہ ساری باتیں آ جاتی ہیں جن کا تعلق فرد اور معاشرہ سے بھی ہے اور ان کے عقائد و اقدار سے بھی، جن کا تعلق طرزِ عمل سے بھی ہے اور نظامِ حیات سے بھی — اُس نظامِ حیات سے جس کی تشکیل معاشرہ نے اقدار، افکار اور قوانین کی شکل میں کی ہے۔ اس موضوع کے قفل کو کھولنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے لفظ „قومی“ پر غور کر لیا جائے۔ قواعد کی رو سے لفظ „قومی“ صفت ہے جس کی نسبت قوم سے ہے۔ قوم کے دو معنی ہیں — ایک محدود اور ایک

* مجلس ادارتِ فکر و نظر نے طے کیا ہے کہ تحقیقی مقالات کے علاوہ اہم علمی موضوعات پر اہل علم کی آراء و معلومات کو بھی قارئین کی خدمت میں پیش کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ „نقطہ نظر“ کے نام سے اس کا آغاز کیا جا رہا ہے۔

** یہ مقالہ ڈاکٹر موصوف نے „بین الاقوامی ادارہ اسلامی فکر“ اور „ادارہ تحقیقات اسلامی“ کے باہمی اشتراک سے منعقد ہونے والے سیمینار (مؤرخہ ۱۹ مارچ ۱۹۹۰ء) میں پڑھا۔

وسیع - محدود معنی میں آدمیوں کے گروہ کو، ایک فرقہ، ایک نسل، ایک ذات کے لوگوں کو اجتماعی طور پر قوم کہا جاتا ہے لیکن وسیع اور جدید معنی میں اس کے معنی ذرا مختلف ہیں - جب ہم قوم کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جاپانی قوم ہے، یہ فرانسیسی قوم ہے، یہ پاکستانی قوم ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایسے لوگوں کا گروہ جو تاریخ و عقائد، زبان و طرز عمل اور طور طریق میں نہ صرف گہری مماثلت رکھتا ہے بلکہ وہ ایک معین و مقررہ خطۂ زمین میں ایک حکومت، ایک قانون، ایک آئین کے تحت رہتا اور زندگی بسر کرتا ہے۔ جاپان ان معنی میں ایک قوم ہے، چین و فرانس ان معنی میں ایک قوم ہے اور پاکستان ان معنی میں ایک قوم ہے۔ قوم کے وسیع معنی میں ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی زبان بولنے والے لوگ اس میں شامل ہوں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ایک طرف ان کی اجتماعی تاریخ ایک ہو، ان کی حکومت، ان کا قانون، ان کا آئین ایک ہو، ان کا متعین خطۂ زمین ہو اور مختلف زبانیں بولنے والے جانے کے باوجود ان کے پاس ایک ایسی مشترک زبان بھی ہو جسے سارے علاقوں میں بولا اور سمجھا جاتا ہو۔ اس نقطۂ نظر سے اپنے ملک پاکستان کو دیکھیں تو یہ متعین خطۂ زمین پر قائم و دائم ہے، اس کا ایک آئین ہے اور اس آئین کے تحت ایک حکومت قائم ہے۔ متعدد زبانوں کے درمیان ایک قومی زبان موجود ہے جو سارے ملک کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ ہے۔ یہاں کی کم و بیش نوے فیصد لوگ ایک مذہب کے پیرو ہیں، سارے علاقوں کے لوگوں کی ایک اور مشترک تاریخ ہے۔ اس ملک کے مختلف علاقوں اور مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان

تاریخ ، ثقافت ، مذہب ، انداز فکر و عمل ، عادات و اطوار اور رسم و رواج میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے اور وہ ساری بنیادی خصوصیات موجود ہیں جو ایک قوم میں پائی جانی چاہئیں ۔ قوم ، جیسا کہ ایک فرانسیسی مفکر ریناں نے لکھا ہے ، دراصل ایک روح ، ایک روحانی اصول کا نام ہے جس کا ایک قدم ماضی میں ہوتا ہے اور ایک حال میں ۔ ایک طرف وہ یادوں کی مشترک اور توانا میراث کی مالک ہوتی ہے اور دوسری طرف ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی گہری خواہش رکھتی ہے ۔ عظمت رفتہ کی مشترک تاریخ پر فخر کرتی ہے اور زمانہ حال میں ان کو جنم دینے کی گہری خواہش رکھتی ہے ۔ اسی لیے ایک قوم ایک عظیم استحکام کا نام ہے جو جذبہ ایثار سے ، اپنی ذات کو معاشرہ کے وسیع تر مفاد پر قربان کرنے سے وجود میں آتا ہے ۔ ایسا ایثار جس کا مظاہرہ ماضی میں کیا جا چکا ہو اور جس کے لیے فرد آج ، پہلے سے زیادہ ، ایثار کے لیے تیار ہو ۔ مشترک زندگی کے عمل کو جاری رکھنے کی رضامندی اور اس گہری خواہش کی کوکھ ہی سے ، حقیقی معنی میں ، قوم جنم لیتی ہے ۔ جتنی زیادہ اور گہری یہ خصوصیات کسی معاشرہ میں موجود ہوں گی اتنا ہی وہ معاشرہ جان دار ، متحرک اور تنومند و توانا ہو گا ۔

جب اس زاویے سے ہم پاکستانی قوم پر نظر ڈالتے ہیں تو پاکستانی قوم میں وہ ساری خصوصیات تو موجود و نظر آتی ہیں جو ایک قوم میں ہونی چاہئیں لیکن سوال یہ ہے کہ آخر وہ روح کیوں نہیں ہے جس سے ایک متحرک اور آگے بڑھنے والی قوم وجود میں آتی ہے ۔ وجہ اس کی بہت سادہ اور واضح ہے ۔ پاکستانی قوم میں مشترک زندگی کے عمل کو جاری رکھنے کی خواہش تو موجود ہے

لیکن یہ خواہش اس وقت کمزور پڑنے لگتی ہے کہ جب قانون کی بالادستی قائم نہ رہے یا جب معاشرہ میں قانون تو موجود ہو لیکن عملاً یہ قانون سب کے لیے یکساں نہ ہو۔ اس عمل نے ہمارے معاشرہ میں جبر و استحصال کو جنم دیا ہے۔ ایک محدود طبقہ عوام کے جبر و استحصال میں مصروف ہے اور اس وجہ سے ناانصافیوں کا وہ عفریت احساس محرومی کا منہ پھاڑے کھڑا ہے جس نے معاشرے کو غریب اور امیر دو طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اسی وجہ سے قوم کے بڑے دھارے میں عوام کی صلاحیت، قوت و ذہانت کا تازہ پانی شامل نہیں ہو رہا ہے۔ کسی معاشرہ میں مشترک زندگی کے عمل کو جاری رکھنے کی گہری خواہش تین عوامل کی موجودگی سے بروئے کار آتی ہے :-

۱۔ یہ معاشرہ ناانصافیوں سے پاک ہو یا کم سے کم بڑی

حد تک پاک ہو۔

۲۔ اس معاشرہ میں معاشی و معاشرتی سطح پر اہلیت کی

بنیاد پر، سب کے لیے یکساں مواقع کا دروازہ کھلا ہو۔

۳۔ اس معاشرہ میں کوئی طبقہ دوسرے طبقے کا استحصال

نہ کر رہا ہو اور منصفانہ قانون کی بالادستی قائم ہو۔

۴۔ یہ معاشرہ تعلیم کی نعمت سے بہرہ مند ہو اور اس

تعلیم کے نتیجے میں اس معاشرہ میں تاریخی شعور موجود

ہو۔ اسی تاریخی شعور سے حُبِ وطن کا جذبہ تیز ہوتا

ہے۔

ہمارے معاشرے میں بحیثیت مجموعی یہ صورت حال نہیں ہے۔ ہم آزادی کے بعد سے اب تک اسی طرح ذہنی غلامی میں گرفتار ہیں اور اسی طرح معاشرہ کے وسائل و اختیار صرف ایک طبقہ خواص تک

محدود ہیں۔ قوانین مملکت اسی کو مضبوط بنا رہے ہیں اور یہ طبقہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے، اپنی دولت و اختیار کے باعث، ناانصافیوں کا چراغ روشن کیے ہوئے ہے اور معاشی و معاشرتی مواقع کے دروازے عوام پر اسی طرح بند ہیں جس طرح دورِ غلامی میں بند تھے۔ یاد رکھیں کہ ہر معاشرہ میں عوام ہی حقیقی قوت کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ عوام جتنے بیدار ہوں گے اور جس حد تک قوم کے وسائل و اختیار سے وہ مساوات کے ساتھ بہرہ مند ہو رہے ہوں گے اسی قدر وہ معاشرہ قوی، زندہ، متحد اور متحرک ہو گا۔ جب یہ صورت نہیں ہو گی تو علاقائی و نسلی تعصبات پروان چڑھیں گے، نفرتوں کے دیپ جلیں گے اور متحد معاشرہ الگ الگ گروہوں، طبقوں اور استحصال کرنے والوں اور استحصال کے شکار طبقوں میں تقسیم ہو جائے گا اور اسی کے ساتھ،،مشرک زندگی، کا عمل کمزور اور ساتھ رہنے کی خواہش کمزور پڑنے لگے گی۔ ہمارا معاشرہ ناانصافیوں، سب کے لیے یکساں مواقع نہ ہونے اور عوام کو قومی زندگی کے بڑے دھارے سے الگ رکھنے کی وجہ ہی سے انتشار کا شکار رہا ہے۔ یہ بات یاد رکھیں کہ قوم مفلوک الحال، جبر و استحصال کے مارے، برس افراد کے مجموعے کا نام ہر گز نہیں ہے۔ اس مسلسل صورت حال سے قوم کی انفرادی و اجتماعی تخلیقی قوتیں بھی متاثر ہوئی ہیں، قوم پٹری سے اُتر گئی ہے اور ثقافت بھی اُس تخلیقی تنومندی سے محروم ہو گئی ہے جو ناانصافیوں سے پاک معاشرہ میں پھلتی پھولتی ہے۔

لفظ،،قوم، کی تشریح کرتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ اس کا گہرا اور براہ راست تعلق طرز فکر اور طرز عمل سے ہے اور انفرادی و اجتماعی طور پر طرز فکر و عمل کا تعلق،،ثقافت، سے ہے۔ جیسا کہ

ہم سب جانتے ہیں کہ ثقافت کا تعلق فرد اور معاشرہ کے اس عمل سے ہوتا ہے جس کی بنیاد میں وہ فکر، عقیدہ، نظریہ یا خیال ہوتا ہے جس پر وہ معاشرہ اور اس کے افراد یقین رکھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ فکر، عقیدہ نظریہ یا خیال، ثقافت کی روح کا نام ہے اور عمل اس کا جسم ہے۔ عمل کا اثر فکر پر پڑتا ہے اور فکر کا عمل پر۔ دونوں ایک دوسرے کو بدلتے بھی ہیں اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ڈھالتے بھی جاتے ہیں۔ جب فکر و عمل کا یہ تعلق کمزور پڑتا ہے اور جب معاشرہ جو کہتا ہے کرتا نہیں اور جو کرتا ہے کہتا نہیں، کے دور میں آ جاتا ہے تو پھر وہ زوال پذیر ہو کر منجمد ہونے لگتا ہے۔ دنیا کی ساری ثقافتوں اور ساری تہذیبوں کا مطالعہ یہی بتاتا ہے کہ بڑی بڑی ثقافتوں کے زوال کا بنیادی سبب یہی ہے۔ اسی لیے فکر و خیال کو جامد ہونے سے بچانے کے لیے معاشرہ کے مفکر اور اہل بصیرت فکر و خیال کی تشکیل نو کے کام کو جاری رکھتے ہیں۔ امام غزالی نے اپنے دور میں یہی کام کیا۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے زمانے میں یہی کام کیا۔ سرسید احمد خاں نے انیسویں صدی میں اور علامہ اقبال نے بیسویں صدی میں مسلم نشاۃ الثانیہ کے لیے یہی کام کیا۔ یہ انتہائی ضروری و بنیادی کام ہے اور ہر دور میں ہوتے رہنا چاہئیں۔ ہمارے دور میں بھی اور آنے والے زمانوں میں بھی۔

زندہ ثقافت کے بارے میں یہ بات یاد رکھنی چاہئیں کہ وہ جامد نہیں ہوتی بلکہ بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ بدلتے کا یہ عمل تدریجاً اس طور پر ہوتا ہے کہ اس کی بنیادی اکائی تو ثابت و سالم رہتی ہے لیکن اس کے رنگ میں ایک نئے امتزاجی رنگ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس تبدیلی کے عمل سے گزرنے کی وجہ سے اس میں ہر دم بدلتی زندگی سے آنکھیں ملانے اور زندگی کے مسائل

کو حل کرنے کی قوت اسی طرح باقی رہتی ہے جس طرح پہلے تھی۔ یہ تبدیلی اس کے دائرہ فکر و عمل کے اندر ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ بھی یاد رکھنی چاہئیں کہ ثقافت ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جب ایک نسل اپنی ثقافتی روایت کو دوسری نسل کو منتقل کرتی ہے تو ان تبدیلیوں کے ساتھ منتقل کرتی ہے جو اس نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، اس میں نئے عناصر شامل کر کے یا پرانے عناصر میں رد و بدل کر کے، کی تھی۔ گویا ثقافت مستقل بھی ہوتی ہے اور بدلتی بھی جاتی ہے۔ تیسری بات یہ یاد رکھنی چاہئیں کہ زندہ ثقافت کسی ایک فرد، جماعت یا طبقے کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ سارے معاشرہ کی ملکیت ہوتی ہے جس میں عوام و خواص، امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ سب شامل ہوتے ہیں۔ چوتھی بات یہ یاد رکھنی چاہئیں کہ ثقافت کے مختلف مظاہر مثلاً زبان و ادبیات، علوم و سائنس، موسیقی و مصوری، فن تعمیر، کھیل کود، شادی بیاہ کے رسم و رواج، کھانے پینے کے طور طریقے، سیاسی و تعلیمی نظام، معاشی و مادی اقدار سب کے پیچھے فکر، عقیدہ اور اخلاق کا ایک نظام ہوتا ہے جو انہیں عملی سطح پر ایک ایسی صورت عطا کرتا ہے جس میں عقیدہ و اخلاق کی روح ہمیشہ موجود رہتی ہے اس بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ پاکستانی معاشرہ بنیادی طور پر مسلمانوں کا معاشرہ ہے۔ اس معاشرے کے عقائد و اخلاق اسلام پر مبنی ہیں۔ اگر آپ سارے معاشرے کے سارے علاقوں کی عورتوں کا رنگا رنگ لباس دیکھیں تو آپ کو ان سب لباسوں میں اسلام کا تصور حیا کارفرما، نظر آئے گا اور کوئی بھی لباس ایسا نہیں ہو گا جس سے عریانی، بے حیائی اور نمائش جسم کا اظہار ہوتا ہو۔ اسی طرح پاکستان کے ہر علاقے کے کھانوں کو دیکھیں۔

سینکڑوں قسم کے لذیذ و لطیف کھانے طرح طرح سے پکائے جاتے ہیں لیکن ان کھانوں میں سے ایک کھانا بھی ایسا نہیں ہو گا جس میں مے ارغوانی کا چھینٹا یا حرام گوشت شامل ہو۔ اسی لیے پاکستانی کھانے لذت و ذائقہ کے اعتبار سے مختلف تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کی بنیاد میں وہ روح اور وہ فکر موجود ہے جو اسلام کی روح سے تعلق رکھتی ہے۔ ان مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر ثقافت کی روح عقیدہ و اخلاق کے ایک مخصوص نظام سے نمو پاتی ہے اور ہر معاشرہ اسی عقیدہ و اخلاق کی صورت پر پیدا ہو کر اپنی ذہنی و مادی صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح مختلف معاشرے مختلف عقائد اور مختلف نظام فکر کے حامل ہونے کی وجہ سے بنیادی طور پر مختلف ہو جاتے ہیں۔ کوئی معاشرہ سرمایہ دارانہ نظام پر اپنے فکر و اخلاق کی بنیاد رکھتا ہے۔ کوئی اشتراکی نظام فکر کے مطابق اپنے معاشرے کی صورت بناتا ہے اور کوئی اسلامی فکر پر اپنے معاشرہ کے تشکیل کرتا ہے۔ جب کوئی عقیدہ، کوئی نظام فکر، کوئی نظریہ کسی معاشرے کی روح بن جاتا ہے تو اس معاشرہ کی ثقافت بھی اسی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ اس طرح ثقافت کسی فکر، کسی عقیدہ، کسی نظام خیال کے طرز زندگی اور طرز عمل بن جانے کی مجموعی صورتوں کا نام ہے۔ کسی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا تو ہم اپنے عقیدہ کے مطابق اللہ کا شکر ادا کرتے اور خیر و برکت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں۔ اذان کی آواز سنتے ہیں تو عورتیں اپنے سروں کو ڈھانپ لیتی ہیں۔ کھانا سیدھے ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ بچہ اگر الٹے ہاتھ سے کھانا کھائے یا سلام کرے تو اسے ٹوکتے ہیں۔ اسلام چونکہ سیدھے ہاتھ کو اہمیت دیتا ہے تو مسلمان اپنے سارے کام سیدھے ہاتھ سے اور سیدھی طرف سے کرتے ہیں۔ نماز ختم کرتے ہیں

تو پہلے سلام سیدھے ہاتھ کی طرف پھیرتے ہیں۔ ہمارا رسم الخط بھی اسی وجہ سے سیدھے ہاتھ کی طرف سے لکھا جاتا ہے۔ پانی پیتے ہیں تو سیدھے ہاتھ سے اور طواف کعبہ کرتے ہیں تو سیدھے ہاتھ کی طرف سے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو عام زندگی میں ہمارا طرز حیات ہے۔ اسی طرز حیات سے ہماری ثقافت نے جنم لیا ہے۔ اس میں دین و دنیا، مادہ و روح، طبعیات و مابعد الطبعیات سب مل جل کر ایک وحدت، ایک اکائی بناتے ہیں اور اس اکائی کی روح میں ہمارا نظام خیال شامل ہوتا ہے۔ اسی عمل سے پیدا ہونے والی مخصوص صورت کا نام ثقافت ہے۔

میرا خیال ہے کہ ثقافت کی اتنی وضاحت میں نہ ضرور کر دی ہے جتنی اس وقت ضرورت تھی۔؟ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جب ہم قومی ثقافت کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو ان سے ہماری کیا مراد ہے؟ اس میں ایک طرف تو یہ بات شامل ہے کہ ملک کے سارے علاقوں کی روح، قومی سطح پر اور بحیثیت مجموعی، معاشرہ کے اندر مشترک ہے اور ان سب علاقوں اور ان میں بسنے والے لوگوں کا کعبہ، مرکز، مخرج و منبع ایک ہے۔ اس زاویے سے جب ہم پاکستان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان سب علاقوں کے طور طریق، فکرونظر اور طرز زندگی میں گہری قربت اور گہری مماثلت موجود ہے۔ ان سب کا عقیدہ ایک ہے، اس عقیدہ سے پیدا ہونے والا طرز زندگی، موسمی و آب و ہوا کے تغیرات کے ساتھ، بنیادی طور پر ایک ہے۔ کوئی ریگستانی علاقہ میں رہتا ہے۔ کوئی پہاڑوں پر رہتا ہے۔ کوئی زرخیز میدانی علاقوں میں رہتا ہے، کوئی برف پوش پہاڑوں کے درمیان رہتا ہے۔ کوئی ساحل سمندر پر آباد ہے۔ جغرافیہ، موسم اور ماحول کے لحاظ سے ان کی ضروریات زندگی اور ان کے

لباس وغیرہ میں فرق ضرور ہے لیکن ان سب کے اندر فکر و عقیدہ کی روح حیات ایک ہے۔ ان کا طرز زندگی کم و بیش ایک ہے۔ اسی لیے ان سب علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں کا رسم الخط ایک ہے۔ ان کی تلمیحات ، علامات و کنایات کا ذخیرہ ایک ہے۔ تصوف کی روایت ایک ہے۔ ان سب زبانوں کا بنیادی ذخیرہ الفاظ بھی ایک دوسرے سے قریب ہے اور پھر ان کے درمیان ، اسی رسم الخط میں لکھی جانے والی اور انہیں تلمیحات ، علامات و کنایات کی حامل ان سب علاقوں میں بولی اور سمجھی جانے والی ایک مشترک قومی زبان بھی موجود ہے جو ان سب علاقوں کے لوگوں کے درمیان رابطے اور اشتراک کا ذریعہ ہے۔ اشتراک ، طرز فکر اور طرز حیات کی یہ نوعیت اس طرح اور اس طور پر بہت کم معاشروں میں اس قدر اور اتنی پائی جاتی ہے۔ یہ وہ حقیقی صورت ہے کہ جو ہمارے لیے ایک نعمت ، ایک خیر اور اجتماعی زندگی کا مثبت پہلو ہے۔ ہم میں ایک صحت مند و توانا اور آگے بڑھنے والی قوم بننے کی جتنی گنجائش موجود ہے اتنی گنجائش دوسرے معاشروں میں کم کم نظر آتی ہے۔

اب آپ یہاں یہ سوال اٹھانے میں یقیناً حق بجانب ہوں گے کہ پھر آخر ہم اب تک صحت مند و توانا قوم بن کر زندگی کو آگے بڑھانے والی ثقافت پیدا کرنے سے کیوں قاصر رہے ہیں ؟ اس کے کئی وجوہ ہیں۔ آئیے ان پر بھی ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہیں :-

ایک وجہ تو یہ ہے کہ دو سو سال کی غلامی سے پیدا ہونے والا ،،ذہن،، ہمیں ،،ورثہ،، میں ملا ہے جس نے ایک طرف ہمیں اپنے مرکز سے ہٹا رکھا ہے اور دوسری طرف اس دور غلامی کی اقدار و تصورات کو ہم نے آج تک اپنے اوپر مسلط کر رکھا ہے۔ آزادی (۱۴)۔

اگست ۱۹۴۷ء) کے بعد بھی ہم اسی ،، ذہن ،، اسی ذہنیت اور انہیں اقدار و تصورات سے چمٹے ہوئے ہیں اور انہیں پر اپنے ،، اداروں ،، کو کم و بیش یکساں صورت میں قائم و برقرار رکھے ہوئے ہیں ۔ دورِ غلامی کے بعد دورِ آزادی کی نئی روح کو ہم نے اپنے معاشرتی ، معاشی ، دفتری اور فکری نظام میں شامل نہیں کیا ہے ۔ اس کے نتیجے میں استحصال کرنے والے طبقے اسی طرح قائم و دائم ہیں اور عوام اسی طرح استحصال کا شکار ہیں ۔ پہلے انگریز آقا تھا ۔ اب طبقہ خواص آقا ہے ۔ صرف آقا بدلے ہیں ۔ نظام نہیں بدلا ۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے معاشرتی و معاشی نظام میں عدل و انصاف کو ، اہلیت کی بنیاد پر یکساں مواقع اور مساوات کو اپنے نظام فکر میں عملاً کوئی جگہ نہیں دی ہے ۔ عوام اسی طرح ناانصافیوں کے جبر کا شکار ہیں جس طرح دورِ غلامی میں تھرجبکہ عوام ۹۸ فی صد ہیں ۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے بحیثیت قوم ، تسلسل کے ساتھ ، سیاسی نظام کو قائم نہیں رکھا ہے اور آزادی کے بعد سے ہماری قومی زندگی ٹوٹ ٹوٹ کر سیاسی اداروں کے بغیر چلتی رہی ہے جس نے حبِ وطن کے جذبہ کو کمزور اور ہماری قومی مرکزیت کو بر سمت کر کے ایشار کے جذبہ کو کم اور مفادات کی ہوس کو تیز کر دیا ہے ۔ اس صورت حال نے لسانی و علاقائی جذبات کو کافی مقدار میں ایک دم جل اٹھنے والا خشک ایندھن فراہم کیا ہے ۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ،، نئے آزاد انسان ،، کی پیدائش کے لیے اپنے نظام تعلیم کو قومی ضرورت اور قومی تقاضوں کے مطابق تبدیل نہیں کیا ہے ۔ وہی نظام تعلیم ، جو دورِ غلامی سے ہمیں ورثہ میں ملا تھا ، ہم نے قبول کر لیا ہے ۔ یہ نظام تعلیم نئی نسل میں تخلیقی قوتیں

اور نئے نئے کارنامے انجام دینے کی خواہش و جذبہ کو نہیں ابھارتا بلکہ معاشرتی زندگی کے ایک ادنیٰ پُرزہ بننے کے لیے تیار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کالج اور ہماری یونیورسٹیاں بے مقصد اور بے سمت تعلیم دے کر بے روزگاری بڑھانے والی فیکٹریاں بن کر رہ گئی ہیں۔ ہم اتنی سی بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جب تک طالب علم کے ذہن میں اُس علم کے، جو وہ حاصل کر رہا ہے، بنیادی تصورات واضح اور صاف نہیں ہوں گے وہ اس علم پر نہ قدرت حاصل کر سکتا ہے اور نہ اس میں کوئی اضافہ یا تخلیقی کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے تعلیم انگریزی کے ذریعہ دی جا رہی ہے اور اس زبان کے ذریعہ علم حاصل کرتے وقت اس علم کے، جو وہ حاصل کر رہا ہے، بنیادی تصورات واضح اور صاف نہیں ہوتے۔ اوسط درجہ کا طالب علم جس کی تعداد ہر جماعت میں نوے فی صد ہوتی ہے اس تعلیمی جبر کا شکار ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ ایک بیرونی زبان سیکھنا، اس پر قدرت حاصل کرنا ایک الگ بات ہے اور بیرونی زبان کے ذریعے علم حاصل کرنا ایک بالکل مختلف اور منفی بات ہے۔ یہ بات جس قدر جلد ہمارے معاشرے کی سمجھ میں آ جائے اسی قدر ہم بند دروازوں کو کھولنے میں کامیاب ہوں گے ورنہ ہمارے ہاں نہ کوئی موجد پیدا ہو سکے گا اور نہ کوئی اعلیٰ سائنس دان، مُفکر، فلسفی یا دانشور پیدا ہو سکے گا۔ گذشتہ ۴۳ سال کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس طرح یہ نظام تعلیم ایک طبقے کے مفادات کی خدمت تو کر رہا ہے لیکن معاشرہ کی کثیر آبادی کی صلاحیتیں بے وجہ ضائع ہو رہی ہیں۔ یہ جو انگریزی میڈیم اسکولوں کی تعداد گھاس پھوس کی طرح روز بروز بڑھ رہی ہے اور بہترین ذریعہ تجارت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام

اور دوسرے احساسِ محرومی کا شکار طبقات اختیار و اقتدار میں شامل ہونے کے لیے انگریزی ذریعہٴ تعلیم کے مدرسوں میں اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے بچوں کو بھیج رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سی ایس ایس اور دوسرے مقابلوں کے امتحانوں میں ۹۸ فی صد عوام کے لیے راستے بند کر کے دو فی صد طبقہٴ خواص کے لیے راستہ کھولنے کے لیے صرف انگریزی کو انٹرویو اور جواب دینے اور لکھنے کی زبان کا درجہ دے رکھا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں انگریزی کے بجائے قومی زبان کو جو پہلی جماعت سے ذریعہٴ تعلیم بنایا گیا تھا اسے بلا اعلان و بلا جواز ۱۹۸۸ء کے اوائل میں ترک کر دیا جب کہ یہ بچے اب نویں جماعت میں آ گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دھڑے نظامِ تعلیم کی وجہ سے ساری قوم تعلیمی سطح پر نراجیت کا شکار ہے۔ دھڑا نظامِ تعلیم ہمارے ذہنی، فکری اور تخلیقِ نظام کے زوال کا سبب ہے۔ جب تک یکساں نظامِ تعلیم قائم و رائج نہیں کیا جائے گا ہم کسی خیر کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ میں اپنی اس بات کو پھر دہراتا ہوں کہ گذشتہ ۳۳ سال کی ہماری تاریخ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اس ساری صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ صحیح اور قومی تقاضوں سے ہم آہنگ، مثبت نظامِ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے، اور تسلسل کے ساتھ سیاسی اداروں کی مثبت روایت قائم نہ ہونے کے باعث، ہم ہر قابلِ قدر چیز اور ہر قابلِ احترام قدر کو کوڑے کے ڈبے میں ڈالنے اور نفرت کے صابن سے ہاتھ دھونے کے عمل میں مصروف رہے ہیں لیکن قوم کو نئی زندگی کا راستہ دکھانے سے دور رہے ہیں۔ یہی وہ منفی اقدار ہیں جو فطری معاشرتی عمل کو روک رہی ہیں اور قوم اور اس کی ثقافت کو صحت مند و توانا نہیں بننے دیتی ہیں۔ مشہور ماہرِ عُمرانیات سوروکن، مختلف قدیم و جدید

معاشرے کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ :

”منفی قدریں جلد یا بدیر خود ان کو فنا کر دیتی ہیں جنہوں نے انہیں سینے سے لگا رکھا ہے۔ ثقافت یا کلچر اسی وقت انسانیت کا اثاثہ بن سکتی ہیں جب اس کی قدریں مثبت ہوں۔ مثبت قدریں زندگی کو آگے بڑھاتی ہیں۔ منفی قوتیں خود زندگی کو تباہ کر دیتی ہیں۔ خود اس کے وجود کو کھا جاتی ہیں۔“

ماہر عمرانیات سوروکن کی اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے آئیے ذرا دیر کو برصغیر کی تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کی داستان مثبت و منفی قوتوں کے عروج کی داستان ہے حتیٰ کہ انفرادی زندگی کی کامیابی و ناکامی کا راز بھی مثبت یا منفی قدروں پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ نفرت، تنگ نظری، جلد غصہ میں بھڑک اٹھنا، تعصب، منافقت، ناانصافی، حیوانیت اور خود غرضی، منفی قدریں ہیں۔ محبت، فراخ دلی، انصاف، انسانیت، تحمل و بردباری، ایثار، اپنے شاندار ماضی پر فخر و افتخار مثبت قدریں ہیں۔ عظیم بہمنی سلطنت مغلیہ سلطنت کے قیام سے تقریباً پونے دو سو سال پہلے برعظیم کے نقشے پر نمودار ہوئی اور مثبت قدروں کے سہارے عروج پر پہنچی لیکن جب طبقہ و فرقہ وارانہ کشمکش، علاقائی تعصبات، لسانی نفرتوں، ظلم و جبر، ناانصافی و خود غرضی نے اس عظیم سلطنت کو گھیر لیا اور ملکی و غیر ملکی کی بنیاد پر محمود گاوای جیسے وزیر کو قتل کر دیا گیا تو دیکھتے ہی دیکھتے یہ سلطنت پانچ ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی اور رفتہ رفتہ ان سب ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے مغلوں نے اپنی سلطنت میں جذب کر لیا۔ خود عظیم مغلیہ

سلطنت جب علاقائی تعصبات ، فرقہ وارانہ کشمکش ، مذہبی فرقہ بندیوں اور ایرانی و تورانی کے جھگڑوں میں پھنس گئی اور خود غرض و تنگ نظری نے ان کی روشنی چھین لی ، وسیع تر قومی مقاصد غائب ہو گئے ، عیاشی ، زبردستی اور دولت کی ہوس نے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو سات سمندر پار سے آنے والی قوم فرنگ نے اسے فتح کر لیا ۔ سرسری راگ کی تیسری داستان کے گیارہویں شعر میں سندھی زبان کے بڑے شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے معلم ، ملاح ، کشتی ، سمندر اور بڑھئی کی علامات کے ذریعے اسی صورت حال کی طرف یوں اشارہ کیا ہے ۔ آپ بھی سن لیجیئے :

،، کشتی سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہے ۔ بڑھئی نے جو میخیں لگائی تھیں وہ کمزور ہو گئی ہیں ۔ معلم اپنی جگہ پر نہیں ہے ۔ اس وجہ سے فرنگی گھس آئے ہیں ۔ اے ملاح ! تیری کشتی میں چور داخل ہو گئے ہیں !۔

یہ وہ چند عوامل ہیں جنہوں نے مل کر ہمیں الٹے راستے پر ڈال دیا ہے ۔ ،، قومی ثقافت، اسی لیے بروئے کار نہیں آ رہی ہے ۔ یہ علاقے اور ان کا جغرافیہ تو آزادی سے پہلے بھی موجود تھا لیکن آزادی کے بعد ، پاکستان کے حوالے سے ، ان کے معنی بدل کر یہ ہو جاتے ہیں کہ اب پاکستان ایک ،، کل، ہے اور یہ سب علاقے اس کا جزو لاینفک ہیں ۔ یہاں پاکستان کی حیثیت ایک ،، کل، کی ہے ۔ اس انداز نظر سے یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ پاکستان ایک قوم کا وطن ہے جو چار علاقوں میں رہتی ہے ۔ یہ چار قومیتوں کا وطن نہیں ہے جو پاکستان میں رہتی ہیں ان دونوں باتوں میں بڑا اور بنیادی فرق ہے ۔ ہمیں اپنی علاقائی ثقافتوں کے مثبت اور مشترک پہلوؤں سے قومی ثقافت کے خدوخال ابھارنے چاہئیں تاکہ اصول وحدت سے پاکستان کی قومی ثقافت

نمایاں و ممتاز ہو سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس اصول وحدت کے نمائندہ اور حقیقی ترجمان ہمارے فراخ دل عوام ہیں اور اسی لیے عوام ہی کو ہمیں اپنی فکر، اپنی حکمت عملی اور سیاسی و ثقافتی نظام خیال میں مرکزی و بنیادی جگہ دینی چاہئیں۔

اس زاویہ نظر کے ساتھ، جس کی وضاحت میں نے آپ کے سامنے کی ہے، اب ہم قومی ثقافت کے تعلق سے،،تشکیل،، کے مسئلہ کی طرف آتے ہیں۔ یہاں اس محدود وقت میں تشکیل کے تعلق سے ساری باتیں بیان کرنا تو ممکن نہیں ہے لیکن چند بنیادی باتوں کی طرف آپ کی توجہ ضرور مبذول کرائی جا سکتی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قومی یک جہتی کے لیے مختلف علاقائی ثقافتوں کے ان پہلوؤں اور عناصر کو ابھارا جائے اور پاکستان کے سارے علاقوں میں پھیلایا اور عام کیا جائے جو سارے پاکستان کے علاقوں میں مشترک ہیں۔ ساتھ ہی علاقائی تقاضوں کے ان مثبت عناصر کو تلاش کیا جائے جن کو قومی سطح پر لانے سے ثقافت کی مثبت قدروں کو فروغ حاصل ہو گا۔ لیکن یہ کام اہم و بنیادی ہوتے ہوئے بھی بے معنی ہو کر رہ جائے گا اگر عدل و انصاف کا یکساں نظام سارے پاکستان میں جاری و ساری نہ کر دیا جائے۔ عدل و انصاف میں یکساں نظام تعلیم بھی شامل ہے اور نامساوات کو دور کرنے والا عادلانہ معاشی نظام بھی ایک طبقہ نے اب تک سیاست، معیشت اور مذہب سب کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا ہے۔ قومی ثقافت اور آگے بڑھنے والی قوم کی تشکیل کے لیے اب اس استحصال کو روکنے کی ضرورت ہے۔ نامساوات ہی وہ اصل بیماری ہے جس کی کوکھ سے ناانصافی پیدا ہوتی ہے۔ اہلیت و صلاحیت بے معنی ہو جاتی ہے اور اقتدار، دولت اور زمین سب سمٹ کر چند

ہاتھوں میں آ جاتی ہے۔ اس نامساوات کی وجہ سے ملک کی آبادی کا ۹۸ فی صد حصہ اپنی فطری ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے پیدائشی حق سے محروم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام زندگی میں عدم تحفظ کے احساس نے احساس محرومی کو جنم دیا ہے۔ ہمارے عوام روئے زمین کے بہترین عوام ہیں۔ صابر و شاکر بھی اور باصلاحیت بھی۔ ان کی صلاحیتوں کو عدل و انصاف اور مساوات کی قدروں کے ذریعہ قومی دھارے کے گدلے پانی میں شامل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ سارا پانی صاف و پاک ہو جائے۔

اسی طرح تشکیل نو کے لیے قوم کے سامنے عظیم مقاصد کو سامنے رکھا جائے اور ان مقاصد کو مقررہ وقت میں حاصل کرنے کے لیے ساری قوم کو متحرک کیا جائے۔ کوئی نظام جو نیچے سے اوپر تک، یکساں طور پر، سارے معاشرے کو سیراب نہ کرے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ضبط و تحمل کے ساتھ اپنے حریف کی بات ٹھنڈے دل سے سننے اور اس کا جواب دینے کی روایت کو اہمیت دے کر عام کیا جائے تاکہ جمہوری روایت کو فروغ حاصل ہو سکے اور معاشرہ کی تربیت ہو سکے۔ بیسویں صدی کی دوسری جنگ عظیم کے بعد مشرقی و مغربی یورپ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ وہاں،،نیا انسان،، پیدا کرنے میں تقریباً دس سال کا عرصہ لگا مثلاً ہٹلر نے دس سال سے کم عرصے میں جرمن قوم کو نازی نظام کے تحت فاشسٹ قوم میں تبدیل کر دیا اور جنگ کے بعد اسی قوم کو تبدیل کرنے میں ایڈینیور (Adenauer) اور ایر ہارڈ (Erhard) جیسے بصیرت رکھنے والے راہنماؤں کو سات سال سے زیادہ عرصہ نہیں لگا کہ اسی معاشرے کو ایک انتہائی جمہوری اور متحرک معاشرہ بنا دیا۔ یہ کام صرف معاشی حکمت عملی سے نہیں بلکہ تعلیمی و ثقافتی

حکمت عملیوں سے ممکن ہو سکا۔ اسی لیے قومی ثقافت کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ ہم ثقافتی رنگ و مزاج کا حامل تعلیمی پروگرام شروع کریں۔ خود ہمارے مفکر، باہر سے ماہرین بلائے بغیر، اس نظام کو وضع کریں اور پھر ساری قوم کو ساتھ لے کر اس پروگرام کو نافذ کیا جائے۔ اس پروگرام کو صرف حکومت خود نہ چلائے بلکہ سارے معاشرے اور عوام کو اس میں شریک کرے اور اسے کامیاب بنانے میں حکومت صرف سہارا دینے کا کردار ادا کرے۔ ہم اب تک سارے کاموں کے لیے صرف حکومت کی طرف دیکھتے ہیں۔ حکومت صرف مدد کرے، سہارا دے اور عوام خود اسے انجام دیں تاکہ ان میں احساس افتخار کے ساتھ اس مقصد کو حاصل کرنے کا جذبہ بیدار ہو۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۹۴۹ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان اپنی سرحدوں پر پاکستانی عوام نے ایک ماہ کے عرصے میں ایک نہر کھود کر تیار کر دی تھی۔ حکومت نے صرف سہارا دیا تھا اور عوام نے خود یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ نہ اس واقعہ پر کوئی افسانہ یا ناول لکھا گیا اور نہ کوئی ڈرامہ پیش ہوا۔ اور اسی لیے یہ عظیم واقعہ آج ہمارے ذہن سے فراموش ہو گیا ہے۔ یہی وہ احساس افتخار ہے جو معاشروں کو تبدیل کر سکتا ہے۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ سارے معاشرے کو اپنے کاموں میں شریک کیا جائے مثلاً ایک ایک گاؤں، ایک ایک دیہات کا جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ وہاں کیا ایسی سہولتیں فراہم کی جائیں کہ وہاں روزگار کے ذرائع پیدا ہو سکیں۔ ہر گاؤں، دیہات میں وہاں کے هنروں اور دستکاریوں کی حوصلہ افزائی صرف سہولت فراہم کر کے کی جائیں تاکہ وہ چھوٹا سا معاشرہ بیدار اور زندہ ہو جائے اور استحصال سے اسے نجات ملے۔ ابتدائی تعلیم میں ان هنروں اور

دستکاریوں کی تربیت بھی شامل ہو جو اس گاؤں یا دیہات میں صدیوں سے جاری ہیں۔ پرائمری تعلیم کو ذہنی تربیت اور بامقصد تعلیم کا مرکز بنا کر اس کام کو انجام دیا جا سکتا ہے۔ اب تک ہمارے ہاں پرائمری تعلیم اور اسکولوں کی جو حالت ہے وہ اس سے کہیں بدتر ہے جو دور غلامی میں تھی۔ پرائمری تعلیم کو، ہر تعصب سے بلند اُٹھ کر، قومی نقطہ نظر سے، اسے دیکھا اور ڈھالا جائے۔ دور غلامی میں انگریزوں نے ہمیں اپنی جڑوں سے کاٹ کر اپنے پیڑ کی جڑوں میں ہماری قلم لگا دی تھی، جس کی وجہ سے ہماری ذہنی نشوونما رک گئی ہے۔ اسے دوبارہ اپنی جڑوں سے پیوستہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے اسی لیے کہا تھا :

ع پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

آئیے اب ایک اور قدر کی طرف آئے ہیں اور وہ ہے اصراف
برے جا کی -

اصراف برے جا ہماری ثقافت کا حصہ بن چکا ہے۔ ہمارے بہت سے معاشی مسائل اسی وجہ سے ہمیں گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ ایک منفی قدر ہے۔ قومی ثقافت کی تشکیل نو کے لیے اس پر توجہ کی ضرورت ہے تاکہ طبقہ خواص سے پیدا ہونے والی یہ بیماری، جو عوام تک سرایت کر گئی ہے اور جُھوٹی نمائش اور معاشرتی مقابلہ کا سبب بن گئی ہے، اسے روک کر دور کیا جا سکے۔ سارا معاشرہ غیر پیداواری سرگرمیوں میں ملوث اور اس کا شکار ہے۔ بدنظمی، لاپرواہی، انسانی ہمدردی و مہربانی کا فقدان، ہوس زر، جس کی وجہ سے سارا معاشرہ زر پرستی کا شکار ہو گیا ہے، ان منفی قدروں کو مثبت قدروں سے بدلنے کی طرف توجہ دی جائے۔ قانون شکنی اور بددیانتی ہمارا قومی مزاج بن گیا ہے۔ یہ منفی قدریں گھن کی طرح

اندر ہی اندر قوم کو کھا رہی ہیں۔ ان کے علاج کے لیے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ یہ وہ چند بیماریاں ہیں جن میں ہمارا معاشرہ مبتلا ہے۔ بیماریوں کی تشخیص بذات خود علاج تلاش کرنے کا راستہ ہے۔ مفکروں کو چاہئیے کہ وہ اس مسئلہ پر غور کریں اور ان بیماریوں کو دور کرنے کے لیے راستہ بتائیں۔ ان بیماریوں کو دور کرنے سے مثبت نتائج پیدا ہوں گے اور ثقافت کا غیر معمولی فروغ ہو گا۔ تعلیم و تربیت کے ذریعہ فرد و معاشرہ میں قانون کی بالادستی و احترام، نظم و ضبط، امن و امان، دوسروں سے محبت و رفاقت کے جذبہ کو فرد کے کردار میں شامل کرنے کے لیے غور کیا جائے۔ جب تک یہ طرز عمل ہمارے قومی کردار کا حصہ نہیں بنے گا، جب تک ان منفی قدروں سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا شعور پیدا اور عام نہیں ہو گا ہم کسی قسم کی ذہنی، تخلیقی یا ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ نہیں دے سکیں گے۔ صرف زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلتا۔

پروپیگنڈا اور کردار سازی کا عمل دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ کردار سازی تخلیقی عمل ہے۔ زندگی کو بامقصد راستے پر لے جاتی ہے اور مثبت، تخلیقی بامقصد و مفید سرگرمیاں اسی سے جنم لیتی ہیں۔

قومی ثقافت کی تشکیل نو کے لیے ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغاں کا ایسا پروگرام شروع کیا جانا چاہئیے جس میں سرکاری اہل کار صرف سہارا دینے کا کام کریں، یہ ہدف سامنے رہے کہ تین سال کے عرصے میں ۸۰ فی صد آبادی کو خواندہ بنانا اور ان کی ذہنی تربیت کرنی ہے۔ ان کے لیے ایسی نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں جن سے فرد کی کردار سازی ہو سکے اور وہ ان قدروں کی اہمیت پر دل سے یقین کرنے لگے جن میں سچائی، نظم و ضبط، شجاعت، حق گوئی و

بے باکی ، امن و امان کی اہمیت ، اہلیت و صلاحیت کی منزلت ، حُبِ وطن ، انسان سے محبت اور قانون کا احترام شامل ہوں۔ اسی نصاب میں اپنے ملک ، اپنے قومی ورثے ، اپنے ملک کے ماحول اور پاکستان کے وجود میں آنے کے اسباب سے بھی واقف کرایا جائے۔ یہ سب کام نیچے سے عوام کی سطح سے ہونے چاہئیں تاکہ اوپر سے غلاف کی طرح چڑھائیں جیسا کہ گذشتہ ۴۳ سال سے ہوتا رہا۔

جب تک معاشرہ میں بامقصد تعلیم عام نہیں ہو گی ، جب تک معاشرہ کو بیدار نہیں کیا جائے گا ، جب تک عوام کو قوم کے بڑے دھارے میں شامل نہیں کیا جائے گا ، جب تک سب کے لیے معاشرتی و معاشی سطح پر یکساں انصاف فراہم نہیں کیا جائے گا ، جب تک اہلیت و صلاحیت کو غیر معمولی اہمیت نہیں دی جائے گی ، جب تک کوئی کارنامہ انجام دینے پر فرد کے احساس افتخار کو سلام نہیں کیا جائے گا ثقافتی تشکیل کا کام ممکن نہیں ہو گا۔

یہ وہ چند باتیں تھیں جو میں نے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر دی ہیں۔ موضوع بڑا ہے اور وقت تنگ ہے اس لیے یہ شعر پڑھ کر اب میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں :

آگرے میاں نصیب ہے سرسبز ہو نہ ہو
دل کی زمین میں تُوخرِ محبت تو بو دیا



ادارہ تحقیقات اسلامی کی مقبول عام تصنیف تقویم تاریخی

مولانا عبدالقدوس ہاشمی

صفحات 378+26 قیمت عمومی ایڈیشن 65.00 روپے

لائبریری ایڈیشن 85.00 روپے

مورخین ، محققین اور تاریخ کے طلباء کے لئے ایک نادر تحفہ
- ہجری اور عیسوی سنین میں تطابق کے لئے سہل الاستعمال کلید

- مشاہیر اسلام کی وفیات اور تاریخ اسلام کے مشہور واقعات
کی توقیت کا خزانہ

یہ تقابلی تقویم پندرہویں صدی ہجری کے اختتام تک آپ کو یہ
جانتے میں مدد دیتی ہے کہ ہر ہجری مہینہ کی پہلی تاریخ کو
عیسوی سن کی کیا تاریخ اور ہفتہ کا کون سا دن تھا، اس طرح
کسی صدی کی کوئی ہجری تاریخ معلوم ہو تو اس کے مقابل عیسوی
تاریخ معلوم کی جا سکتی ہے اور بالعکس عیسوی تاریخ معلوم ہو تو
اس کے مقابل ہجری تاریخ دریافت کی جا سکتی ہے - طلباء اور
محققین کیلئے ایک بیش قیمت تحفہ ہے -

پچھلی چودہ صدیوں میں اہم تاریخی واقعات مزید برآں بعض
مشاہیر اسلام کی وفات کا ذکر بھی متعلقہ تاریخوں کے ساتھ کر دیا
گیا ہے -